مقالات

توحید کے دلائل انفس میں

از

جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے پھر جب عقل و تمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک موخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پروائی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دور ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ بے پروائی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائلِ آفاق کی بنیاد درحقیقت نفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان و زمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے۔ اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کیلیے یہ تمام عالم تیرہ و تار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم بالکل ظلمات ہوتا۔ چنانچہ جو بلید آسمان و زمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ان کے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے۔ اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، دل نشیں بھی ہیں اور مستحکم بھی۔ جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے:۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور خود تمہارے نفوس کے اندر بھی، کیا تم نہیں دیکھتے؟

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالم النفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہد فطرت توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے رسالہ "حقیقت شرک" کی آخری دو فصلوں میں کی ہے۔ یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعم حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ وہاں ہم نے علمائے سائنس کے اس دعویٰ کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اس سے ان کی عبادات کا تصور پیدا ہوا۔ اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسباب زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو۔ جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے۔ نعمت کا شعور ایک منعم کے شعور کو مستلزم ہے۔ اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکر گذاری کا جذبہ اور تصور پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ نہ تو الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی

کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک، جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گذاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں، عدل سے تعبیر کرتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے بھی ناپتا ہے۔ اور اسی جذبۂ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدل فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلا وجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں 'ظلم عظیم' یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے۔ اور سب سے بڑا ظلم شرک۔ اس عدل کو قرآن نے فطرت انسانی کے عہد سے تعبیر کیا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ

اور یاد کرو جب لیا تمہارے پروردگار نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا ان کے اوپر کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ بولے ہم گواہ ہیں یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے حقیقت شرک کی آخری فصل میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے یہاں نقل کرتے ہیں:

"بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے؟ ہمیں تو نہ اس الست بربکم کی کوئی خبر ہے نہ اس بلیٰ کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں بالخصوص جبکہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد ہر شکل ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔ لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو یہ بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر، اور کتنے دکھ اٹھا کر، مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر، ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں، اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جاں کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور و پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے بچہ جوان ہو، اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں، اور وہ مستغنی۔ لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبے کے مسلم ہے یہ ذمہ داری (Responsibility) اور استحقاق (Privilege) کا وہ فطری عہد ہے جس

زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔"

"اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوجاتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، وقت اور آزادی، جان اور مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑجائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کردیں۔ اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے۔ اس کے حفظان صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے۔ اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے۔ اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے۔ اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دیدے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے۔ اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کے جوکھم میں پڑنے کا اقرار نہیں کیا تھا تو کیا اس کا جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاق غلیظ کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔"

"یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں۔ اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کردیں۔ ہم جس مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم اس کے گھاس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کرسکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہوجاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

"اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت

کو وجود بخشا ہے۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدہ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان و قبیلہ کو وجود بخشا جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھکر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم رعی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں کہ گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدہ استحقاق کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہے جس نے گائے اور گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔"

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکرگذاری کی جائے اور اس شکرگذاری میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھیرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا تَعْبُدُونَ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ قَالَ هَلْ يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ أَوْ يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ قَالُوا بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ يَفْعَلُونَ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ وَالَّذِي يُمِيتُنِي ثُمَّ يُحْيِينِ وَالَّذِي أَطْمَعُ أَنْ يَغْفِرَ لِي خَطِيئَتِي يَوْمَ الدِّينِ (۸۲-شعرا)

اور سناؤ ان کو ابراہیم کی سرگذشت، جب اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، یہ تم لوگ کس چیز کی پوجا کر رہے ہو؟ بولے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر پوجتے رہیں گے۔ پوچھا کیا یہ سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو؟ کیا یہ تم کو کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ بولے بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ کہا ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم پوجتے ہو، تم اور تمھارے اگلے بزرگ۔ یہ سب تو میرے دشمن ہیں مگر عالم کا رب جس نے مجھے پیدا کیا، پھر ہدایت بخشتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے صحت بخشتا ہے اور جو مجھے مارے گا پھر زندہ کرے گا اور جس سے مجھے توقع ہے کہ جزا کے دن میرے گناہ بخشے گا۔

یعنی ایک منعم ہستی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں۔ جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا۔ جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی۔ جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم و کرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں ہمارے ساتھ اچھا ہوگا، بلاشبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی تمام تر دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق اس کی شکرگذاری کی صورت میں ادا کریں اور اس عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھیرائیں۔ یہ صریح بے انصافی اور نہایت کھلا ظلم عظیم ہے۔

۲۔ علم و یقین کی فطری طلب انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابل میں علم، اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو۔ اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو۔ وہ اپنی ہستی کی غایت اور اس کے نیک و بد

سے بالکل بے خبر ہو۔ کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسرے کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے، اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے۔ وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کر لے اور اسی پر جم جائے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ ان سوالات سے سرے سے کوئی تعرض ہی نہ کرے۔ انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کی مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح جگہ نہ پا کر کسی غلط چیز ہی کو اختیار کر لیا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہانے ہیں جن سے طبیعت کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جا سکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب (آگاہ! صرف اللہ کی یاد سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے)۔ یہی وہ روشنی ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہو جاتا ہے۔ اللہ نور السموات والارض (اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے)۔ اس کو پا لینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصور کر سکتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعین کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔ اب اس کے لیے اخلاق کے اصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہو سکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرۃ ایک فیصلہ کر سکتا ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل و حواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا۔ اور جس راہ میں جو قدم بھی رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اب اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل و حواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے حواس غلطی کر جاتے ہیں لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک جاتی ہے لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر نہیں مامور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظر انداز کر دینا بداہت کا انکار ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو بہ تکلف انسان نے اختیار کی ہے ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ایک "لا ادری" کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے۔ اور انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے۔ الا آنکہ وہ اپنی فطرت کو مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفات کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت و صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح تر جواب اور عقل کی جستجو کا اصلی مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا جو تمام صفات کمال سے متصف ہے انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بھی بنا لیے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب اس کے کسی زائد شے کو ماننا ایک امر واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرت انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے۔

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۱۶-۱۱۷-مومنون)

پس بادشاہ حقیقی بلند و برتر ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، باعظمت عرش کا مالک اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے گا جس کے لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو اس کا حساب اس کے رب کے پاس ہے۔ کافر فلاح نہیں پائیں گے۔

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اندر اور باہر سے پا رہا ہے اس لیے اس کا ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی خدائی میں شریک ٹھیراتا ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرکاء کے ابطال پر دلائل قائم کرے کیونکہ مشرک ایک خدا کو تو بہر حال مانتا ہی ہے۔ یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے۔ باقی رہے شرکاء و انداد جو اس نے فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے لیے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے لیے دلائل کی۔ ان کی تردید کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۳- فطرت انسانی کا علو: توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرت انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا ہے اور سروری و سرفرازی کا خواہشمند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساس برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرتاً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دنیا میں آیا ہے۔ اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی و برتری کا احساس نہ ودیعت کیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ الآیۃ میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے۔ کبھی اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى پکار اٹھتا ہے۔ کبھی انا اُحیی و اُمیت (میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے لیکن اس احساس برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں، بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آکر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو، جو کسی کے آگے جھکنا نہیں جانتی، ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قوتوں اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان و زمین کی مالک و مدبر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس

میں بالطبع کہتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے۔ اس میں اصلی ولولہ تو خدا بننے کے لیے ہے لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچائے جائے لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرت کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ کبر نفس اور علو کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ بسا اوقات یہ کسی طرح بھی اعتراف حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے جو مدعی تھا کہ "میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں اسی لیے میں ہی رب ہوں"۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ "اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اسے مغرب سے طلوع کردو"۔ اس کے عجز کو بے نقاب کردیا اور وہ اس معارضہ سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا لیکن کبر نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جن کی عقل درست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علو اور ضعف دونوں کے توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم و قدیر ہستی کے آگے جھک کے اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پا لیتے ہیں۔ اور ان کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گداگر کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام مایحتاج پا لینے کے باوجود دردر صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دنائت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ بسا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل و بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے۔ جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزت نفس ہے اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ ایک چھنال عورت ہے جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

بس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدائی کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا ہے جو ایک خدا کو مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پر ہو گیا اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کے الگ ہو جائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے۔ اگر تمہیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو۔ مجھے اس سے معاف رکھو۔

وللناس اشجان ولی شجن وحدی   تحمل اصحابی ولم یجدوا وجدی

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں اشارہ فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے قیدخانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے:۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۔

اور میں نے پیروی کی اپنے بزرگوں، ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کے مذہب کی۔ ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم اللہ کا کسی کو ساجھی ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر اور لوگوں پر احسان ہے لیکن اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۰ - ۱۲ یوسف)

اے میرے قید خانہ کے ساتھیو، کیا بہت سے الگ الگ رب بہتر ہیں یا ایک ہی اللہ جو سب کو تابو میں رکھنے والا ہے۔ نہیں تم پوجتے ہو اس کے سوا مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ نہیں ہے اختیار مگر اللہ کے ہاتھ میں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ بندگی کرو مگر اس کی۔ یہی فطری دین ہے لیکن اکثر نہیں جانتے۔

اس تقریر کے ابتدائی حصہ کی روح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا۔ اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت و عزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنے نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے۔ اور انسان اپنے نفس کے علو کے باوجود اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے مانے بغیر اس کی فطرت کا خلا پُر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد قہار کی اطاعت کی جائے؟ ظاہر ہے کہ خوددار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے۔ وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسان کی فطرت بھی اُسی ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے۔ لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اس علو کی بنا پر موحد و مشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹ - زمر)

اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص (غلام) کی جس میں بہت سے جھگڑنے والے آقا شریک ہیں اور ایک شخص (غلام) کی جو سموچا ایک ہی شخص (آقا) کا ہے۔ کیا دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے؟ شکر ہے اللہ کے لیے۔ بلکہ اکثر ان میں سے نہیں جانتے۔

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کرتا ہے۔ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے بعد فطرت انسانی کی صدائے حال بتائی کہ الحمد للہ۔ یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

انسان کے اسی علو فطرت کو مخاطب کرکے سوال کیا گیا ہے۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹ - زمر)

کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ہے۔

یہی علو نفس ہے جس کو ایک انسان شرک میں آلودہ ہوتے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعۃً رفعت و عزت کے اس آسمان سے جس پر

اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے۔ انتہائی ذلت کی حضیض میں گر جاتا ہے۔ ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق۔ اور دوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ (۱۸ - الحج)

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہتیرے انسانوں میں سے بھی اور بہت سے ایسے ہیں جن پر عذاب واجب ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے تو ان کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے اور بے شک اللہ کرتا ہے جو چاہتا ہے۔

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گذاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴۔ انسان کا ضعف و افتقار چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے۔ ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اگلوا لیتا ہے۔ فضاؤں میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے۔ سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں سے کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اس کے بنائے ہوئے قانون طبیعی کی بھی پابند ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو پکڑے اور پھر ان کے قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اٹھائے۔ یہ تمتع بھی بس ایک مدت تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک ان دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے۔ انتم الفقراء الی اللہ اور دوسری جگہ فرمایا ہے واللہ الغنی وانتم الفقراء اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤد، حضرت سلیمان، ذوالقرنین اور فاروق اعظم ہیں لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے اردگرد دولت کی فراوانی، خدم و حشم کی کثرت اور طاقت و قوت کے کرشمے دیکھ کر بیخود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور ابولہبوں کے

اثر ضلالت ہیں۔ جن لوگوں پر اس طرح خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی و ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں۔ اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی اصلی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکا، خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ لشکر یا اس کے غیبی شرکا و انداد سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات بچ رہتی ہے جس کا دامن رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے:

قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُونَهُ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً لَئِنْ أَنْجَانَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ قُلِ اللَّهُ يُنَجِّيكُمْ مِنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ أَنْتُمْ تُشْرِكُونَ (۶۳-۶۴ انعام)

پوچھو کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم اس کو پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے کہ اگر اس نے ہم کو رہائی دی اس آفت سے تو ہم شکرگزاروں میں سے بنیں گے۔ کہہ دو اللہ ہی ہے جو تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور ہر مصیبت سے پھر تم اس کا ساجھی ٹھہراتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنْجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۲۲-۲۳ یونس)

وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں، یہاں تک کہ جب تم ہوتے ہو کشتی میں اور کشتیاں ان کو لے کر ساز گار ہوا سے چلتی ہیں اور وہ مگن ہوتے ہیں تند ہوا آتی ہے اور موجیں ان پر ہر طرف سے گھیرے ڈالتی ہیں اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے پکارتے ہیں اللہ کو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے کہ اگر تو نے ہم کو اس آفت سے نجات دی تو ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے پس جب ان کو نجات دیدی دفعۃً وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بلا کسی حق کے۔

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی کتنی سچی مثال ہے! دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حسن انتظام پر مغرور ہوتا ہے۔ اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے، اپنے سروسامان اور اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے اور خدا کی اطاعت و شکرگزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے لیکن جب دفعۃً ساز گار ہوا طوفانی ہو جاتی ہے، کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرکاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا۔ بلکہ تیرا شکرگزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا۔ نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی۔ لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے، پھر وہی غفلت اور سرمستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سروسامان اور جس گھمنڈ کو اس نے ابھی بے حقیقت پایا تھا اسی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو خدا نے ختار اور کفور، عہد شکن اور ناشکرا کہا ہے کیونکہ فطرت

کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آکر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفران نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے امن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا ہے تو وہ کبھی انانیت، خودسری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پا کر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے۔ لیکن بس بھول جاتا ہے اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریب اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو انما اوتیتہ علی علم (ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے سائنس کے زور سے ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیے تھے، جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

فہرست کتب مکتبہ جماعت اسلامی

(جو اس وقت موجود ہیں)

رسالۂ دینیات	عہ	تجدید و احیائے دین	عہ	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول عہ حصہ دوم عہ حصہ سوم عہ			
مسئلۂ قومیت	عمہ	تنقیحات	عہ	پردہ	عہ	روداد جماعت اسلامی حصہ اول ۲ر حصہ دوم	۹ر
حقوق زوجین	عمہ	حقیقت شرک	عمہ	مذہبی زلزلے	عہ	سلامتی کا راستہ	۶ر
اسلام اور جاہلیت	۶ر	دین حق	۶ر	اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶ر	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۶ر
جہاد فی سبیل اللہ	۶ر	راہ عمل	۶ر	نشان راہ	۴ر	اسلام کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ر
نیا نظام تعلیم	۴ر	خدا کی اطاعت کس لیے؟	۴ر	خطبۂ تقسیم اسناد	۸ر	مسلمانوں کی طاقت کا اصلی منبع	۲ر
ایک اہم استفتاء	۲ر	نیشنلزم اینڈ انڈیا	۹ر	مولانا سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر			عہ
تفسیر سورۂ قیامہ	۸ر	دستور جماعت اسلامی	۲ر	قرآن اور پیغمبر	۵ر	مسلمان کا بنیادی عقیدہ (شکل چارٹ)	۲ر
عبادت	۲ر	ایمان کی کسوٹی	۲ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ر	لا الٰہ کے معنی	۲ر
دینیات (انگریزی)	عہ	اسلام کیا ہے؟ (انگریزی)	عہ	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے (انگریزی)			۹ر

(زیر طبع مطبوعات)

اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر — قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں